اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ)

مترجمہ: جناب مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی

(۲)

اہل الحدیث اور اہل الرائے میں اختلاف کے اسباب

حضرت سعید ابن مسیّب، ابراہیم نخعی اور امام زہری کے زمانہ میں، نیز امام مالک اور سفیان ثوری کے عہد میں، اور اس کے بعد بھی، علماء کا ایک گروہ ایسا تھا جو مسائل شرعیہ میں غور و فکر کرتے وقت رائے[1] کے استعمال کو سخت ناپسند کرتا تھا اور ناگزیر ضرورتوں کے ماسوا، فتویٰ دینے اور مسائل کا استنباط کرنے کی کبھی ہمت نہ کرتا تھا۔ ان کی توجہات کا سب سے بڑا مرکز رسول اللہ کی حدیثوں کا بیان کرنا تھا۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا "مجھے یہ گوارا نہیں کہ تمھارے لیے کوئی ایسی چیز حلال کر دوں جس کو اللہ نے تم پر حرام کیا ہے،[2] یا کسی ایسی چیز کو حرام کر دوں جس کو اللہ نے تمھارے لیے حلال کیا ہے"۔ حضرت معاذ ابن جبلؓ کا ارشاد ہے "لوگو: بلا کے نازل ہونے سے پہلے اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ،[3] کیونکہ ہر زمانہ میں ایسے مسلمان موجود رہیں گے جو (اپنے وقت کے پیش آمدہ مسائل میں) پوچھنے پر صحیح جواب دے دیا کریں گے"۔ اسی طرح کے اقوال حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے بھی منقول ہیں، جن میں فرضی مسائل میں سوال و جواب

---

[1] "رائے" ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کی تعریف اوپر متن مضمون میں گذر چکی ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ جب تک مجھ کو کسی آیت یا کسی حدیث سے ایک چیز کی حلت یا حرمت معلوم نہ ہو جائے، محض اپنی رائے سے اس کو حلال یا حرام نہیں کہہ سکتا، ورنہ خدشہ ہے کہ کہیں ایسی چیز کو حلال نہ کہہ دوں جو فی الواقع خدا کے نزدیک حرام ہے، یا اس کے برعکس۔

[3] یعنی جو معاملہ حقیقتاً پیش نہ آیا ہو اس کے متعلق سوال نہ کرو۔ قبل از مرگ واویلا سخت بے عقلی کی بات ہے۔ (مترجم)

کوکروہ قرار دیا گیا ہے ۔ حضرت ابن عمرؓ نے حضرت جابر ابن زید سے فرمایا کہ "تم بصرہ کے فقہا میں سے ہو، دیکھو! جو فتوی بھی دینا، قرآن ناطق یا سنت جاریہ ہی سے دینا، اگر تم نے اس کے خلاف کیا تو خود بھی ہلاک ہوگے اور دوسروں کو بھی ہلاک کروگے"۔ ابو نضر کہتے ہیں کہ "جب حضرت ابو سلمہ بصرہ تشریف لائے تو میں اور حسن بصری ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، انھوں نے حسن بصری سے فرمایا، آپ ہی حسن ہیں؟ بصرہ میں آپ سے زیادہ کسی کی ملاقات کا مجھے شوق نہ تھا جس کا سبب یہ ہے کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنی رائے سے فتوی دیتے ہیں، سو ایسا نہ کیجیے، فتوی صرف سنت رسول سے دیجیے یا اللہ کی اتاری ہوئی کتاب سے"۔

ابن المنکدر فرماتے ہیں کہ "عالم، اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان داخل ہوا کرتا ہے، اس کو چاہیے کہ اس (نازک اور پرخطر) مقام سے (صحیح سلامت) نکلنے کی راہ تلاش کرے"۔[۱] امام شعبی سے سوال کیا گیا کہ "جب آپ لوگوں سے مسائل پوچھے جاتے تھے تو آپ کیا کیا کرتے تھے"؟ امام موصوف نے سائل سے فرمایا کہ "(اچھا ہوا) تم نے بڑے واقف کار ہی سے بات پوچھی (یعنی میں اس بات سے بخوبی واقف ہوں، سو سنو!) ہم کرتے یہ تھے کہ) جب ہم میں سے کسی شخص کو مخاطب کرکے فتوی پوچھا جاتا تو وہ اپنے کسی رفیق سے کہتا کہ آپ اس کا جواب دیجیے، پھر وہ دوسرا کسی تیسرے پر اس فرض کو ڈال دیتا۔ یہ سلسلہ یوں ہی آگے چلتا رہتا یہاں تک کہ وہ استفتا پھر گھوم کر پہلے ہی شخص کے پاس آپہنچتا"۔ یہی امام شعبی ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ "یہ لوگ (یعنی فتوی دینے والے) جو کچھ رسول اللہ صلعم کی طرف سے تم کو سنائیں، اس کو لے لو، اور جو کچھ اپنی رائے سے کہیں اسے مزبلہ پر پھینک دو"۔ —— ان تمام آثار کو امام دارمی نے نقل کیا ہے۔

تدوین حدیث کا دور ان اسباب اور حالات کے ماتحت اسلامی ممالک میں احادیث رسول اللہ اقوال صحابہ کے اکٹھا کرنے اور رسالوں اور کتابوں میں انھیں لکھ لینے کا رواج اتنا عام ہوگیا کہ شاید ہی کوئی

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ عالم شرع کی ذمہ داریاں سخت نازک ہیں۔ وہ اللہ اور بندوں کے درمیان کا واسطہ ہوا کرتا ہے جس کے ذریعہ سے بندوں کو اللہ تعالی کی مرضیات کا علم ہوتا ہے۔ پس اگر کسی عالم نے اپنی اس گراں ذمہ داری کی ادائگی میں سہل نگاری سے کام لیا اور احکام شرع کی تبیین و تبلیغ میں اپنے ذاتی رجحانات کو دخل دیا تو بدترین انجام سے دوچار ہوگا۔ اس کو پوری احتیاط اور خدا ترسی کے ساتھ اس نازک ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ (مترجم)

عالم حدیث ایسا باقی بچا ہو جس کے لیے کسی مجموعۂ احادیث یا رسالہ یا کتاب کا موجود ہونا اہم ترین ضرورت نہ قرار پا گیا ہو۔ (یہ ذوق و انہماک شیفتگی کی اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ) علم حدیث کے جو اکابر اس زمانہ میں موجود تھے انھوں نے حجاز، شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان کے باقاعدہ دورے کر کے حدیث کی کتابوں کو جمع کیا، اس کی تصنیفات کا کھوج لگایا اور ان احادیث اور آثار کو بھی ڈھونڈھ نکالنے میں پوری قوت صرف کر دی جو غریب[۵۱] اور نادر تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی کوششوں سے احادیث و آثار کا اتنا بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا جس کی مثال اب تک کی تاریخ علم حدیث میں ناپید تھی، جس کی وجہ سے ان لوگوں کو وہ بات حاصل ہو گئی جو پچھلوں کو نصیب نہ ہو سکی تھی۔ ان حدیثوں کی سندیں اتنی کثرت سے بہم پہنچیں کہ ان میں سے کتنی ہی حدیثیں ایسی تھیں جن کی سندیں سو، بلکہ سو سے بھی اوپر تک جا پہنچی تھیں۔ (اس کثرت اسانید کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ) حدیث کے بعض وہ ٹکڑے، جو ایک سند کی روایت میں مخفی رہ گئے تھے دوسری سند کے ذریعہ روشنی میں آ گئے، اور یہ متعین کرنا آسان ہو گیا کہ کون سی حدیث غریب ہے اور کون سی مشہور۔ پھر یہ بھی کہ ان علما کے لیے مختلف حدیثوں کے شواہد[۵۲] اور متابعات میں غور و فکر کرنا ممکن ہو گیا اور ان کے دائرہ معلومات میں بے شمار ایسی صحیح اور مستند حدیثیں آ گئیں جن سے اب تک کے اہل فتویٰ بے خبر تھے، چنانچہ بروایت ابن ہمام، امام شافعی نے امام احمد سے صاف فرمایا تھا کہ "آپ لوگ احادیث صحیحہ کے ہم سے زیادہ جاننے والے ہیں، اس لیے آپ کے پاس جو بھی حدیث صحیح ہو مجھ کو بتا دیا کیجیے تاکہ میں اس کی پیروی کا شرف حاصل کر سکوں خواہ وہ حدیث کسی قسم کی ہو، کوفی ہو یا بصری، یا شامی"، اس کی وجہ یہ تھی کہ کتنی ہی صحیح حدیثیں ایسی ہیں جن کے روایت کرنے والے صرف ایک ہی مقام کے لوگ تھے ــــ مثلاً وہ غریب حدیثیں جن کو صرف اہل شام بیان کرتے ہیں یا صرف اہل عراق ــــ اسی طرح بہتیری حدیثیں ایسی ہیں جن کی روایت صرف ایک خاص خاندان میں محصور ہے۔ مثلاً وہ مجموعہ احادیث جس کو "نسخہ برید" کہا جاتا ہے اور جس کے بیان کرنے والے صرف

---

۵۱ "غریب" اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو صرف ایک راوی بیان کرتا ہے۔

۵۲ ان حدیثوں کو ایک دوسرے کا شاہد کہا جاتا ہے جو مختلف صحابہ سے مختلف راویوں کے ذریعہ روایت ہوئی ہوں مگر مضمون سب کا ایک ہو۔ اور اگر راوی تو مختلف ہوں مگر سب کے سب ایک ہی صحابی سے حدیث بیان کرتے ہوں اور مضمون بھی سب روایتوں کا ایک ہی ہو تو اس طرح کی روایتوں کو ایک دوسرے کا متابع کہا جاتا ہے۔ (مترجم)

برید ہیں جو ابی بردہ سے اور ابی بردہ ابو موسیٰ سے روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ مجموعۂ احادیث جو نسخۂ عمرو بن شعیب کے نام سے مشہور ہے اور جس کے راوی صرف عمرو بن شعیب ہیں جو اپنے باپ سے اور ان کے باپ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں ---- دوسری وجہ یہ تھی کہ بعض صحابہ گمنام اور کم حدیثیں جاننے اور بیان کرنے والے تھے جن سے صرف چند لوگ ہی روایتیں لے سکے۔ پس اسی طرح کی حدیثیں تھیں جو عام اہل فتویٰ کی نظروں سے اوجھل رہ گئیں۔ (لیکن ان کے بالمقابل اصحاب حدیث کا حال یہ تھا کہ نہ صرف احادیث ہی کا پورا ذخیرہ ان کے سامنے آچکا تھا بلکہ) ایک ایک بستی کے فقہائے صحابہ و تابعین کے آثار ان کے پاس جمع ہوگئے درانحالیکہ ان سے پہلے ایک شخص صرف ان روایتوں کو جمع کرسکتا تھا جو اس کے اپنے اہل شہر اور اپنے شیوخ کے توسط سے مل سکتی تھیں۔ (پھر ایک دوسرا فرق عظیم یہ تھا کہ) اب تک راویوں کے نام اور ان کے مراتب عدالت[1] سے واقفیت کا سارا دارومدار حالات اور قرائن کی اس سرسری مشاہدہ پر تھا جو بالعموم نگاہ انسانی کو حاصل ہوا کرتا ہے، لیکن اب اس گروہ نے اس فن میں پوری طرح داد تحقیق دے کر اس کو تصنیف و تالیف اور بحث و تمحیص کا ایک مستقل موضوع بنادیا اور بحث کرکر کے اس کے عیب و صواب وغیرہ کا فیصلہ کیا۔ اس تصنیفی اور تحقیقی جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ احادیث پر سے ابہام کے وہ پردے اٹھ گئے جن کے نیچے ان کے اتصال[2] یا انقطاع کی حقیقتیں پوشیدہ تھیں۔ (اور صریح طور پر معلوم ہوگیا کہ کون سی حدیث متصل ہے اور کونسی منقطع)۔ چنانچہ امام سفیان ثوری اور وکیع اور ان کی طرح کے دوسرے خادمانِ علم حدیث نے (جمع حدیث میں) سرتوڑ کوششیں کیں مگر اس کے باوجود ایک ہزار بھی متصل اور مرفوع احادیث نہ جمع کرسکے، جیسا کہ ابوداؤد سجستانی کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے جو اہل مکہ کے نام لکھا گیا تھا۔ اس طبقہ کے لوگوں کی روایت کی ہوئی حدیثوں کی تعداد مجموعی طور پر چالیس ہزار یا اس کے لگ بھگ پہنچتی ہے (باقی کو انھوں نے تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر متروک اور ناقابل قبول قرار دیدیا)۔ امام بخاری سے تو یہاں تک

[1] "عدالت" اصول حدیث کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد یہ ہے کہ راوی عاقل بالغ مسلمان ہو۔ فسق اور بے حیائی وغیرہ عیوب سے پاک ہو۔ ثقاہت سے گری ہوئی حرکتیں نہ کرتا ہو۔

[2] اتصال کا مطلب یہ ہے کہ سندِ حدیث میں تمام راویوں کا نام مذکور ہو۔ اور "انقطاع" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی راوی چھوٹ گیا ہو۔

مروی ہے۔ اور بروایت صحیح مروی ہے۔ کہ انھوں نے اپنی کتاب "صحیح بخاری" کو چھ لاکھ حدیثوں سے انتخاب کرکے مرتب کیا۔ اسی طرح امام ابوداؤد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "سنن ابی داؤد" کو پانچ لاکھ کے ذخیرہ سے چن کر مدون کیا۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی کتاب "مسند احمد بن حنبل" کو ایک میزان کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کیا جس کے ذریعہ حدیث نبوی کی صحت کا وزن معلوم کیا جاسکتا ہو، یعنی جو حدیث اس کتاب کے اندر موجود ہو، وہ تو اپنی واقعی بنیاد رکھتی ہے، اگرچہ صرف ایک ہی طریقہ سے مروی ہو، اور جو حدیث اس میں نہ پائی جا سکے اس کے متعلق سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بالکل بے اصل ہے۔

ان علمائے حدیث میں (جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے) عبدالرحمٰن ابن مہدی، یحییٰ ابن سعید قطان، یزید ابن ہارون، عبدالرزاق، ابوبکر ابن ابی شیبہ، مسدّد، ہنّاد، احمد ابن حنبل، اسحٰق ابن راہویہ، فضل ابن دکین اور علی ابن مدینی اور انہی کے ہم پلہ کچھ اور بزرگوں کے اسمائے گرامی نمایاں حیثیت کے مالک ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا طبقہ طبقات محدثین کا سرعنوان ہے۔ ان میں سے وہ، جو تحقیق و تدبر کی نعمت سے سرفراز تھے، فن روایت کو باقاعدہ اور مستحکم کرنے اور مراتب حدیث کی پوری واقفیت بہم پہنچا لینے کے بعد فقہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ سو اس بارے میں ان کی یہ رائے نہ ہو سکی کہ گزشتہ ائمہ فقہ میں سے کسی خاص شخص کی تقلید پر اتفاق کر لیا جائے، جبکہ وہ اپنی آنکھوں ایسی احادیث اور آثار دیکھ رہے تھے جو کہ گرد وپیش پھیلے ہوئے تمام فقہی مذاہب کے (کتنے ہی مسائل میں) صریح مخالف تھے۔ اس لیے انھوں نے احادیث رسول اور آثار صحابہ و تابعین اور اقوال مجتہدین سب پر تحقیق و تجسس کی نگاہ ڈالنی شروع کی جس کے لیے ان کے ذہنوں میں کچھ پختہ اصول متعین تھے۔ ہم اس موقع پر ان اصولوں کا ایک اجمالی تذکرہ کیے دیتے ہیں۔

علمائے حدیث کے اصول استنباط مسائل

مسائل کے بارے میں ان کا دستور یہ تھا:

اگر کسی مسئلہ میں قرآن کچھ (صراحت کے ساتھ) کہہ رہا ہے تو اس وقت ارشاد قرآنی سے منہ پھیر کر کسی اور شے کی طرف جانا جائز نہیں۔

اگر فرمودہ قرآنی (اپنے مفہوم میں بالکل واضح اور صریح نہ ہو بلکہ) مختلف پہلوؤں کا احتمال رکھتا ہو

تو حدیث نبوی کو ایک پہلو کی تعیین کے لیے حکم بنایا جائے گا۔

جب کسی مسئلہ کے متعلق قرآن کو بالکل خاموش پاتے اس وقت یہ لوگ حدیث رسول کو اختیار کرتے خواہ یہ حدیث مشہور ہو اور فقہاء کے درمیان قبول عام کا مقام رکھتی ہو یا (اس کے برعکس) اس کی شہرت اور اس سے واقفیت کا دائرہ کسی ایک شہر یا ایک خاندان یا ایک سلسلۂ روایت تک محدود ہو یا چاہے اس پر صحابہ اور فقہاء نے عمل کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ غرض جب کوئی حدیث موجود ہوتی تو اس کے سامنے اس کے مخالف کسی اثر یا کسی مجتہد کے اجتہاد کو کوئی اہمیت نہ دی جاتی۔

پھر جب کسی مسئلہ کے متعلق یہ لوگ انتہائی جستجو کے باوجود کوئی حدیث نہ پاتے تو صحابہ اور تابعین کی کسی ایک جماعت کے اقوال کو لے لیتے۔ (لیکن یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ) اس باب میں ان لوگوں کا یہ دستور نہ تھا کہ دوسرے تمام صحابہ و تابعین کو چھوڑ کر ہر مسئلہ میں کسی ایک ہی مخصوص جماعت یا کسی خاص شہر کے اہل علم کے اقوال کو یہ حیثیت دی جائے جیسا کہ اس سے پہلے کے اہل فقہ کا چلن تھا۔ (بلکہ ان کا قاعدہ یہ تھا کہ) اگر کسی مسئلہ میں جمہور فقہا اور تمام خلفائے راشدین کو ایک رائے پر متفق پاتے تو اس رائے کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیتے۔ اور اگر ان میں باہم دگر اختلاف نظر آتا تو اس صورت میں اس شخص کی بات کو ترجیح دیتے جو علم، خدا ترسی اور ضبط احادیث کے لحاظ سے سب میں اونچا ہوتا، یا پھر ان اقوال میں سے اس قول کو اختیار کرتے جو زیادہ مشہور ہوتا۔ اور اگر کوئی مسئلہ ایسا پاتے جس میں دو برابر کے قول ہوتے تو وہ ان کے نزدیک "دو قولوں والا مسئلہ" کہلاتا (اور ہر قول یکساں قابل اتباع ہوتا)۔

لیکن جب یہ اتنی سعی کے بعد بھی ان کی نگاہ جستجو ناکام ہو جاتی (اور صحابہ و تابعین کے اقوال میں بھی ان کو کسی مسئلہ کا جواب نہ ملتا) تو نصوص کتاب و سنت کے عموم، ان کے اشارات، اور ان کے مقتضیات میں غور و خوض کرتے اور مسئلہ کے نظائر کو اس پر محمول کر کے جواب معلوم کرتے بشرطیکہ مسئلہ اور نظیر مسئلہ میں ظاہری طور پر مماثلت نظر آتی۔ اس باب میں وہ کچھ لگے بندھے اصولوں کی غلامی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا سارا انحصار اور اعتماد محض اپنی فہم اور طمانیت قلب پر ہوتا تھا، جیسے کہ کسی حدیث کے متواتر ہونے کا فیصلہ کرنے والی میزان راویوں کی کوئی تعداد اور ان کی عدالت کی توثیق نہیں ہے بلکہ وہ یقین تھا جو سامعین حدیث کے دلوں میں

حدیث (کو اس کے تمام سلسلوں کے ساتھ سننے) کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ صحابہ کے احوال بیان کرتے وقت ہم بتا چکے ہیں۔

ان اصولوں کا ماخذ علمائے حدیث کے یہ اصول و قواعد، جن کا اوپر ذکر ہوا، سلف کے طریق فکر و عمل اور ان کی واضح تصریحات سے ماخوذ تھے۔ میمون ابن مہران کہتے ہیں کہ:

"جب کوئی شخص حضرت ابوبکرؓ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرتا تو فیصلہ کے لیے قرآن کو بنظر غائر دیکھتے۔ اگر وہاں کوئی ہدایت موجود ملتی تو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے، اور اگر ایسا نہ ہوتا اور اس معاملہ کے متعلق کوئی حدیث ان کے اپنے علم میں ہوتی تو اسی کو اپنے فیصلہ کی بنیاد قرار دیتے، لیکن جب اپنا ذخیرۂ احادیث اس معاملہ میں رہنمائی کرنے سے انکار کر دیتا تو پھر باہر تشریف لاتے اور عام مسلمانوں سے پوچھتے، میرے سامنے فلاں معاملہ پیش ہوا ہے کیا تم میں سے کسی کو اس طرح کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ معلوم ہے؟ تو بسا اوقات آپ کے اردگرد لوگوں کی ایک معقول تعداد جمع ہو جاتی اور ہر شخص رسول اللہ صلعم کا فیصلہ بیان کرتا، جس کو سن کر حضرت صدیق اکبرؓ فرماتے کہ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے ہمارے اندر ایسے افراد پیدا کیے ہیں جو ہمارے پیغمبر کے ارشادات محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ اور جب اپنی امکانی کوششیں صرف کرنے کے باوجود حضرت موصوف کو کوئی حدیث رسول نہ ملتی تو سربرآوردہ اور بہترین دل و دماغ رکھنے والے افراد کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے، اور جب وہ سب کسی رائے پر اتفاق کر لیتے تو اسی کے مطابق آپ اپنا فیصلہ صادر فرماتے۔"

اسی طرح حضرت عمرؓ کے متعلق قاضی شُریح کی روایت ہے کہ:

"انھوں نے (یعنی حضرت عمرؓ نے) ان کے پاس (یعنی قاضی شریح کے پاس) فرمان بھیجا تھا کہ اگر تمھارے پاس کوئی ایسا معاملہ آئے جس کا حکم اللہ کی کتاب میں موجود ہو تو اسی کے مطابق فیصلہ کرو، خبردار! زید و بکر کی رائیں اس کی طرف سے تمھاری توجہ نہ ہٹائیں۔ اور اگر کوئی ایسا معاملہ تمھاری عدالت میں پیش ہو جس کے بارے میں کتاب الٰہی کوئی حکم نہ دے رہی ہو تو سنت رسول کو دیکھو اور اس کی رہنمائی میں فیصلہ کرو، لیکن اگر کسی معاملہ میں نہ کتاب الٰہی کا کوئی حکم موجود ہو نہ ہی سنت کا، تو پھر

یہ دیکھو کہ جمہور کا اتفاق اس قسم کے معاملہ میں کس چیز پر ہے (اگر کوئی متفق علیہ رائے مل جائے تو) اسی کو اپنے فیصلہ کے لیے اختیار کر لو۔ اور اگر یہ صورت پیش آجائے کہ کتاب الٰہی میں معاملہ کا کوئی فیصلہ نہ ملے، سنت نبوی بھی خاموش ہو اور اس بارے میں اپنے کسی پیشرو کا کوئی قول بھی تم کو نہ دستیاب ہو سکے تو دو باتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرو، اگر چاہو کہ اپنی رائے سے اجتہاد کرکے فوراً معاملہ کا فیصلہ سنا دو تو ایسا بھی کر سکتے ہو، اور اگر چاہو کہ (اجتہاد کے بعد فیصلہ نافذ کرنے میں) تاخیر اور مزید غور و فکر سے کام لو تو اس کی بھی اجازت ہے، (لیکن جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے) میں تاخیر اور مزید غور و فکر ہی کو تمہارے حق میں بہتر سمجھتا ہوں۔"

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ:

"ایک زمانہ ہم پر ایسا گزرا ہے جب کہ ہم معاملات کا فیصلہ نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اس کے اہل تھے[۵۲]، لیکن اب مشیت ایزدی نے ہم کو اس جگہ لا کھڑا کیا ہے جس کو تم دیکھ رہے ہو، تو سنو! آج کے بعد جس کسی کے سامنے کوئی معاملہ پیش ہو اس کو چاہیے کہ اس معاملہ کا فیصلہ کتاب الٰہی کے مطابق کرے اور اگر کوئی ایسا معاملہ آئے جس کے متعلق کتاب الٰہی میں حکم مذکور نہ ہو تو رسول اللہ صلعم کے فیصلوں پر نظر کرے اور انہی کے بموجب فیصلہ دے، لیکن جب کوئی ایسا معاملہ سامنے آئے جس کے بارے میں نہ تو کتاب الٰہی کچھ کہہ رہی ہو نہ ہی رسول اللہ صلعم کا کوئی فیصلہ معلوم ہو تو علمائے صالحین کے فیصلے کو اختیار کرے، اور اس سلسلہ میں یہ نہ کہے کہ "میں ڈرتا ہوں[۵۳] اور میری رائے یہ ہے" کیونکہ حرام اپنی جگہ واضح ہے اور حلال بھی واضح ہے اور کچھ چیزیں ان کے درمیان ہیں جن کی حلت اور حرمت واضح نہیں، سو (ان چیزوں کے حلال یا حرام قرار دینے میں یہ اصول سامنے رکھو کہ) جو چیز دل میں کھٹکے اس کو چھوڑ دو اور جو ایسی نہ ہو اس کو اختیار کر لو۔"

حضرت ابن عباسؓ سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو اس کے بارے میں اگر قرآن کا کوئی حکم ہوتا تو اسے

---

۵۲ اس زمانہ سے مراد رسول اللہ صلعم کا اور خلفائے راشدین کا زمانہ ہے۔

۵۳ مطلب یہ ہے کہ جب قرآن یا سنت یا اجماع صالحین سے کسی مسئلہ کا حکم معلوم ہو جائے تو خواہ اس کے بیان کرنے میں جھجک ہو اس سے کام نہ لے۔ (مترجم)

بتا دیتے۔ اور اگر قرآن میں اس کا حکم نہ پاتے اور سنت رسول میں مل جاتا تو وہ سنا دیتے اور جب ان دونوں کو خاموش پاتے تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فیصلوں کو سامنے رکھ کر جواب دیتے۔ لیکن جب یہاں سے بھی کوئی چیز نہ ملتی تو بطور خود اجتہاد کر کے اپنی رائے سے فیصلہ کرتے۔ انہی حضرت ابن عباسؓ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں تنبیہ کی کہ:

"کیا تمھیں یہ کہتے ہوئے کہ رسول اللہ کا فرمانا یہ ہے اور فلاں شخص[1] کا کہنا یہ ہے، اس امر کا خوف نہیں آتا کہ تم پر عذاب آ دھمکے یا تمھیں زمین میں دھنسا دیا جائے۔"

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ: "ابن سیرین نے ایک شخص کو رسول اللہ صلعم کی کوئی حدیث سنائی تو اس نے کہا کہ اس مسئلہ کے متعلق فلاں شخص یہ کہتا ہے۔ ابن سیرین نے جواب دیا کہ میں تجھ کو رسول کریم کی حدیث سناتا ہوں اور تو کہتا ہے کہ فلاں کا قول یہ ہے۔"

امام اوزاعی سے منقول ہے کہ: "عمر بن عبدالعزیز نے فرمان صادر کیا تھا کہ کتاب اللہ کے حکم کے سامنے کسی شخص کی رائے کا کوئی وزن نہیں، ائمہ مجتہدین کی رائے صرف اس مسئلہ میں قابل لحاظ ہے جس کے متعلق خدا کی کتاب میں کوئی حکم نہ نازل ہوا ہو اور نہ ہی کوئی ارشاد نبوی وارد ہوا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سنت مقرر فرما دی ہو اس میں کسی شخص کی رائے بال برابر بھی وقعت نہیں رکھتی۔"

اعمش سے روایت ہے کہ: "ابراہیم نخعی اس بات کے قائل تھے کہ (مقتدی کو جب کہ وہ تنہا ہو) امام کے بائیں جانب کھڑا ہونا چاہیے، میں نے ان کو سمیع زیات کے حوالہ سے حضرت ابن عباس کی یہ روایت سنائی کہ جب ایک بار نماز تہجد میں وہ آنحضرت صلعم کے بائیں طرف کھڑے ہو گئے تھے تو آنحضرت صلعم نے ان کو وہاں سے ہٹا کر دائیں طرف کھڑا کر لیا۔ ابراہیم نخعی نے یہ روایت سن کر اپنے خیال سے رجوع کر لیا۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ "امام شعبی کے پاس کوئی آدمی ایک مسئلہ پوچھنے آیا۔ امام موصوف نے جواب دیا کہ اس مسئلہ میں حضرت عبداللہ ابن مسعود کی رائے یہ ہے۔" اس نے کہا "آپ اپنی رائے بتائیے۔" یہ سن کر امام شعبی نے فرمایا "لوگو! کیا تمھیں اس شخص پر حیرت نہیں ہوتی؟ میں نے تو اس کو ابن مسعود کا فتویٰ بتا دیا اور

---

[1] یعنی قول رسول کے مقابلہ میں کسی اور کا قول پیش کرنا موجب ہلاکت ہے۔ مترجم۔

وہ ہے کہ میری رائے پوچھ رہا ہے ؛ میں تو اپنے طریقِ جواب کو اپنی ذاتی رائے کے اظہار سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں خدا کی قسم میری زبان سے کسی گیست[1] کا نکلنا مجھے پسند ہے مگر یہ پسند نہیں کہ (ابن مسعود جیسے جلیل القدر صحابی اور واقفِ اسرارِ شریعت کے فتویٰ کے مقابلہ میں) اس سے اپنی رائے کا اظہار کروں۔"

ان تمام آثار کو دارمی نے نقل کیا ہے۔

اسی طرح امام ترمذی نے ابی سائب کی یہ روایت نقل کی ہے کہ "ہم لوگ وکیع کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک شخص سے، جو رائے سے کام لینے کے حامی تھا، فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار[2] کیا ہے مگر امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اشعار مُثلہ ہے"! اس شخص نے جواب دیا "اس کی وجہ یہ ہے کہ ابراہیم نخعی نے اشعار کو مُثلہ قرار دیا ہے۔" میں نے دیکھا کہ یہ الفاظ سنتے ہی وکیع غصہ سے بیتاب ہو گئے اور فرمایا میں تجھ سے کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے اور تو اس کے مقابلہ میں ابراہیم نخعی کا قول سنا رہا ہے! یقیناً تو اس قابل ہے کہ قید میں ڈال دیا جائے اور اس وقت تک باہر نکالا جائے جب تک کہ اپنے اس قول سے رجوع نہ کرلے!"

حضرت عبداللہ بن عباس، عطاء، مجاہد اور مالک ابن انس رضی اللہ عنہم فرمایا کرتے تھے کہ "کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کی ہر بات آنکھ بند کر کے مان لی جائے اور جس کی کچھ باتیں قابلِ تسلیم اور کچھ قابلِ رد نہ ہوں بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔"

اس طریقِ فقہ کی کامیابی غرض سلفِ صالحین کے یہ اسوے تھے جن کو سامنے رکھ کر علمائے حدیث نے اتباعِ شریعت اور استنباطِ مسائل کے مذکورہ بالا قواعد کا تعین کیا۔ پھر جب انھوں نے فقہ کو ان جدید بنیادوں پر مرتب کر کے مسائل پر نظر ڈالی تو ان مسائل میں سے، جن پر پہلے گفتگو ہو چکی تھی یا جو اب ان کے سامنے پیش آرہے تھے، کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس کے متعلق کوئی نہ کوئی حدیث انھیں نہ مل گئی ہو ۔۔۔ خواہ وہ مرفوع اور متصل ہو، خواہ مرسل، خواہ موقوف، صحیح ہو خواہ حسن[3] خواہ کسی اور طرح کی قابلِ اعتبار ۔۔۔ یا پھر

[1] گیست نکلنے سے مراد یہ ہے کہ زبان سے کوئی لغو سی بات نکل جائے۔ [2] "اشعار" ایک شرعی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قربانی کے اونٹ کی کوہان کو دائیں طرف سے کچھ دھار دار لے کر اس طرح زخمی کر دیا جائے کہ وہ خون میں لت پت ہو جائے۔
[3] "حسن" اصطلاح ہے اصولِ حدیث میں اس روایت کو کہتے ہیں جس کی سند متصل ہو، شذوذ اور علت سے محفوظ ہو لیکن اس کے راوی علمی حیثیت سے کچھ کمزور ہوں۔ ۔ مترجم

ناسخ و منسوخ بتائی ہیں، اور جو حدیثیں بظاہر ایک دوسرے کی مخالف تھیں ان میں تطبیق بھی دے دی۔ اس طرح اپنی ان مبارک کوششوں کے ذریعہ امام مسلم نے کسی ایسے شخص کے لیے جو زبان عربی سے واقف ہو، سنت کی شاہراہ چھوڑ کر کسی اور طرف جانے کا عذر باقی نہیں رہنے دیا۔

امام ابوداؤد تیسرے بزرگ امام ابوداؤد سجستانی ہیں۔ جن کے سامنے یہ مقصد تھا کہ ان حدیثوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے جو فقہا کا مدار بحث اور ان میں زیادہ مشہور ہیں اور جن پر علماء امصار نے احکام کی بنیاد رکھی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے اپنی کتاب مرتب کی اور اس میں صحیح اور حسن اور وہ ضعیف حدیثیں جمع کیں جو کسی نہ کسی وجہ سے قابل عمل تھیں۔ چنانچہ امام مذکور فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث درج نہیں کی ہے جو تمام علمائے حدیث کے نزدیک قابل ترک ہو" پھر ہر حدیث کے ساتھ ساتھ انہوں نے ضعیف روایتوں کے ضعف کی تصریح بھی کر دی ہے اور جن روایتوں میں کوئی علت[1] تھی اس کے بیان میں ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ فن حدیث میں نظر رکھنے والا اس کو اچھی نگاہ تعمق سے جانچ لے۔ اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) ہر حدیث بیان کرنے سے پہلے کسی ایک ایسے مسئلہ فقہی کو اس کا عنوان تجویز قرار دے دیا جس کو کسی نہ کسی عالم نے اس حدیث سے مستنبط کیا ہو اور جو کسی نہ کسی کا مذہب ہو۔ یہی وجہ ہے امام غزالی وغیرہ کے اس قول کی کہ "ابوداؤد کی کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے۔"

امام ترمذی چوتھے امام ابو عیسیٰ ترمذی ہیں۔ ان کے متعلق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک طرف تو تصحیح روایت میں امام بخاری اور مسلم کے طریقے کو پسند کیا تھا، دوسری طرف فقہا و علماء کے مذاہب جمع کرنے میں امام ابوداؤد کی روش کے گرویدہ تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی کتاب کی تالیف میں ان دونوں ہی خوبیوں کو جمع کر لیا۔ مزید برآں یہ بھی کیا کہ صحابہ اور تابعین اور دوسرے فقہائے ملت کے مذاہب بھی بیان کر دیے۔ اس طرح ایک ایسی جامع تصنیف تیار کی جس میں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ حدیث کی مختلف سندوں کا اس طور پر اختصار کیا گیا ہے کہ ایک سند تو ذکر کر دی ہے اور باقی کی طرف صرف اشارے کر دیے ہیں۔ پھر ہر حدیث کے متعلق اس کے صحیح یا حسن یا ضعیف یا منکر[2] ہونے کی نیز ضعیف راویوں کے سبب ضعف کی وضاحت بھی کر دی ہے تاکہ طالب فن کو پوری بصیرت حاصل ہو اور معتبر و غیر معتبر احادیث میں امتیاز کر سکے۔ اس کے ساتھ ہر حدیث کے بارے میں یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ وہ مستفیض ہے یا غریب۔ ان سب باتوں کے سوا صحابہ اور فقہائے اسلام کے مذاہب بھی نقل کرتے گئے ہیں اور اس سلسلہ میں حسب ضرورت کسی کا نام اور کسی کی کنیت بیان کی ہے۔ غرض فن حدیث کے طالب علم کے لیے کوئی حجاب حقیقت اس کتاب میں باقی نہیں رہنے پایا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ "وہ مجتہد کے لیے کفایت اور مقلد کے لیے بس کرتی ہے۔"

(یہ تھے اہل الحدیث۔ اب ان کے بالمقابل اہل الرائے کا گروہ ہے (جن کے طرز فکر و عمل کا ہمیں آگے جائزہ لینا ہے)

(باقی)

[1] علت حدیث کے متن یا اس کی سند کے اس نقص کو کہتے ہیں جو صرف تحقیق کی گرفت میں آ سکے۔

[2] "منکر" اس ضعیف حدیث کو کہتے ہیں جو کسی حدیث صحیح یا حسن کی مخالف ہو۔ (مترجم)

رَسائل و مَسائل

نظامِ کفر کی قانون ساز مجلس میں مسلمانوں کی شرکت کا مسئلہ

سوال :- آپ کی کتاب "اسلام کا نظریۂ سیاسی" پڑھنے کے بعد یہ حقیقت تو دلنشین ہوگئی ہے کہ قانون سازی کا حق صرف خدا ہی کے لیے مختص ہے اور اس حقیقت کے مخالف اصولوں پر بنی ہوئی قانون ساز اسمبلیوں کا ممبر بنا عین شریعت کے خلاف ہے۔ مگر ایک شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ اگر تمام مسلمان اسمبلیوں کی شرکت کو حرام تسلیم کریں تو پھر سیاسی حیثیت سے مسلمان تباہ ہوجائیں گے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی قوت ہی سے قوموں کی فلاح و بہبود کا کام کیا جاسکتا ہے اور ہم نے اگر سیاسی قوت کو بالکلیہ غیروں کے حوالے ہوجانے دیا تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ اغیار مسلم دشمنی کی وجہ سے ایسے قوانین نافذ کریں گے اور ایسا نظام مرتب کریں گے جس کے نیچے مسلمان دب کر رہ جائیں، پھر آپ اس سیاسی تباہی سے بچنے کی کیا صورت مسلمانوں کے لیے تجویز کرتے ہیں؟

جواب :- آپ نے اپنے سوال میں سوچنے کا انداز غلط اختیار کیا ہے۔ یہ بات تو آپ کی سمجھ میں آگئی ہے کہ وہ نظام جس میں انسان خود اپنا قانون ساز بنتا ہے یا دوسرے انسانوں کو قانون سازی کا حق دیتا ہے، سرے سے غلط ہے۔ نیز یہ بات بھی آپ سمجھ چکے ہیں کہ امرِ حق یہی ہے کہ حکم صرف اللہ کے لیے ہے اور انسان کا کام اس کے حکم کا اتباع کرنا ہے نہ کہ خود واضعِ حکم بن جانا۔ اب آپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ مسلمان جن کے مفاد کی آپ فکر کر رہے ہیں وہ کس غرض کے لیے "مسلم" نامی ایک جماعت بنائے گئے تھے؟ آیا اس غرض کے لیے کہ وہ اس امرِ حق کو جو قرآن سے ثابت ہے، دنیا کے سامنے پیش کریں، اس کو تسلیم کرائیں، خود اپنی زندگی کو اس پر قائم کریں اور دنیا میں اس کو جاری کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر دیں؟ یا اس غرض کے لیے کہ اس کے بالکل برخلاف جو باطل بھی دنیا میں قائم ہوجائے (اور خود ان کی اپنی غفلتوں کی بدولت قائم ہو) اُس کی موافقت کریں اور اس کو اپنا لیں اور اسے مٹانے کی سعی سے اس لیے گریز کرتے رہیں کہ کہیں ان کے مفاد کو نقصان نہ پہنچ جائے؟

اگر پہلی بات ہے تو مسلمان آج جو کچھ کر رہے ہیں، غلط کر رہے ہیں، اور ان کا مفاد اگر اس غلطی سے وابستہ ہے تو ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اس کی پروا کی جائے، اور ایسی صورت حال میں ایک سچے مسلمان کو اپنی قوم کے ساتھ تنگ نظر قوم پرستی کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے امر حق کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس کی قوم اس کا ساتھ دے یا نہ دے؛ اور اگر آپ دوسری بات کے قائل ہیں تو پھر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، حق کو حق جاننے کے باوجود خلاف حق طریقہ پر اگر محض قومی مفاد کی خاطر آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔

یہ اندیشہ اکثر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر ہم اسمبلیوں سے پرہیز کریں تو ان پر غیر مسلم قابض ہو کر نظام حکومت کے تنہا مالک و متصرف بن جائیں گے اور اگر نظام باطل کے کل پرزے ہم نہ بنیں تو دوسرے بن جائیں گے اور اس طرح زندگی کے سارے کاروبار پر قابض ہو کر وہ ہماری ہستی ہی کو ختم کر دیں گے، حتیٰ کہ اسلام کا نام لینے والے باقی ہی نہ رہیں گے کہ تم ان سے خطاب کر سکو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اندیشے جتنے ہولناک ہیں اس سے زیادہ خام خیالی کے نمونے ہیں۔ اگر ہم نے یہ کہا ہوتا کہ صرف ایک منفی پالیسی اختیار کر کے مسلمان زندگی کا سارا کاروبار چھوڑ دیں اور گوشوں میں جا بیٹھیں تو یہ اندیشے ضرور کسی حقیقت پر مبنی ہوتے، لیکن ہم اس نفی کے ساتھ ساتھ ایک اثبات بھی تو پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اس نظام کے ساتھ سازگاری کرنے کے بجائے دنیا میں نظام حق قائم کرنے کے لیے منظم سعی شروع کریں اور دوسری قوموں کے ساتھ اپنے دنیوی مفاد کے لیے کشمکش اور مزاحمت کرنے کے بجائے ان کے سامنے وہ دین حق پیش کریں جس کی پیروی میں تمام انسانوں کی فلاح ہے، اور قرآن کے ذریعہ سے، سیرت رسولؐ کے ذریعے سے اور اخلاق اسلامی کے ذریعے سے دنیا میں فکری، اخلاقی، معاشی اور تمدنی اور سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری اس دعوت کے جواب میں دو صورتیں پیش آ سکتی ہیں:

ایک یہ کہ تمام ہندوستان کے مسلمان جن کی تعداد دس کروڑ ہے، اور جن کے پاس مادی وسائل اور ذہنی اور دماغی قوتوں اور ہاتھ پاؤں کی طاقتوں کی کمی نہیں ہے، بیک وقت ہماری اس دعوت کو قبول کر لیں اور ذہنی، اخلاقی اور عملی تمام حیثیتوں سے اسلام کے سچے داعی بن جائیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو آپ تو یہ اندیشہ کر رہے ہیں کہ سب کچھ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ ہندوستان